حدیث وسنت

حافظ عمران ایوب لاہوری☆

فتنۂ انکارِ حدیث کے نئے شبہات کا جائزہ

فتنہ انکارِ حدیث رسول اللہ ﷺ کی اس پیشین گوئی کا مصداق ہے جس کے مطابق ایسے لوگوں کا ظہور ہوگا جو صرف قرآنِ کریم کی اتباع کو ہی کافی وشافی سمجھیں گے۔①

چنانچہ ابتداءً دوسری صدی ہجری میں عراق میں اور بعدازاں تیرہویں صدی ہجری میں برصغیر پاک و ہند میں اس فتنہ کا ظہور ہوا۔

دوسری صدی ہجری میں اس فتنہ کے بانی خوارج اور معتزلہ تھے۔ خوارج کو تاریخ اسلام کا اوّلین فرقہ شمار کیا جاتا ہے۔② خوارج کی وجہ تسمیہ ان کا ائمۃ المسلمین اور مسلمانوں کے خلاف خروج کو حلال سمجھنا ہے۔③ اس فرقہ کا بنیادی عقیدہ ہی یہ تھا کہ صرف قرآن کی بات تسلیم کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حدِ رجم کا انکار کیا، کیونکہ اس کا ذکر قرآن میں نہیں۔ اسی بنا پر اکثر ائمہ خوارج کی تکفیر کے قائل ہیں۔ دراصل خوارج نے کچھ ایسے غلو آمیز اور انتہا پسندانہ نظریات قائم کر رکھے تھے جن کی بقا انکارِ حدیث کے بغیر ممکن ہی نہ تھی۔ اس لئے وہ صرف انہی احادیث کو قبول کرتے جو ان کے عقائد کی مؤید ہوتیں اور باقی کا انکار کر دیتے تو اس طرح انکارِ حدیث کا آغاز ہوا۔④

انکارِ حدیث کے آغاز کے سلسلے میں دوسرے جس فرقے کا نام لیا جاتا ہے وہ معتزلہ ہے۔ معتزلہ کی وجہ تسمیہ حضرت حسن بصریؒ کا یہ قول ہے کہ اعتزل عنا یعنی ''وہ (واصل بن عطا)

☆ ریسرچ سکالر مجلس التحقیق الاسلامی مصنف سلسلۂ کتب: فقہ الحدیث

① سنن ابوداؤد (۴۶۰۵)، جامع ترمذی (۲۶۶۳)، سنن ابن ماجہ (۱۳)

② مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۴۹/۳

③ الخوارج از شیخ ناصر بن عبدالکریم العقل: ص ۲۸

④ ایضاً، مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ: ۴۸/۱۳، ۴۹

ہم سے الگ ہوگیا۔'' اس کے الگ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے مرتکبِ کبیرہ کے متعلق حضرت حسن بصریؒ کی اس رائے سے اختلاف کیا تھا جس پر مسلمانوں کا اجماع تھا۔ چنانچہ واصل اور اس کے ساتھ الگ ہونے والے 'معتزلہ' کہلائے۔[5] اُنہوں نے دراصل یونانی فلسفہ سے متاثر ہوکر عقل کو فیصلہ کن حیثیت دے رکھی تھی۔[6] لہٰذا یہ صرف وہی اسلامی احکامات تسلیم کرتے جو عقل کے تقاضوں پر پورے اُترتے۔ یوں اُنہوں نے بھی بہت سی ایسی صحیح اَحادیث کو ردّ کردیا جو ان کے عقائد ونظریات کے خلاف تھیں۔

ردِّ حدیث کے لئے اُنہوں نے دو حربے اختیار کر رکھے تھے، ایک یہ کہ حدیث کے بارے میں یہ شک دلوں میں ڈالا جائے کہ وہ فی الواقع حضور ﷺ کی ہیں بھی یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ اُصولی سوال اٹھایا جائے کہ کوئی قول یا فعل حضورؐ کا ہو بھی تو ہم اس کی اطاعت و اتباع کے پابند کب ہیں؟ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ ہم تک قرآن پہنچانے کے لئے مامور کئے گئے تھے، سو اُنہوں نے وہ پہنچا دیا، اس کے بعد محمد بن عبداللہ ﷺ ویسے ہی ایک انسان تھے، جیسے ہم ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا اور کیا وہ ہمارے لئے حجت کیسے ہوسکتا ہے؟[7]

یہ فتنہ کچھ ہی عرصہ میں روبہ زوال ہوگیا، کیونکہ اس کے سدِباب کے لئے ائمہ محدثین نے پوری جستجو سے تحقیقات پیش کیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ، امام بخاریؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ، امام غزالیؒ اور امام ابن حزمؒ جیسے جبالِ علم اس کی راہ میں حائل ہوگئے اور عقلی ونقلی دلائل کے ذریعے اس کی تردید کرکے اسے مزید پنپنے سے روک دیا۔ علاوہ ازیں سنتِ نبویؐ کے بغیر بڑی حد تک دین کا حلیہ ہی بدل جانے کے باعث اُمتِ اسلامیہ کے اجتماعی ضمیر نے بھی اس فتنہ کو قبول نہیں کیا جس بنا پر اسے دم توڑنا ہی پڑا اور پھر صدیوں تک اس کا کہیں نام ونشان بھی نظر نہ آیا۔[8]

---

⑤ اعتقاد اهل السنة شرح اصحاب الحدیث: ص ۳۷

⑥ اعتقاد أئمة الحدیث از ابوبکر اسماعیل: ص ۶

⑦ سنت کی آئینی حیثیت، از مولانا مودودیؒ: ص ۱۴

⑧ فتنة إنكار السنة از سمیر عبدالحمید ابراہیم: ص ۱۲ تا ۱۰

تیرہویں صدی ہجری میں اس نے دوبارہ جنم لیا۔ اب اس کا مقامِ پیدائش برصغیر پاک وہند تھا۔ واضح رہے کہ دوسری صدی ہجری کی بہ نسبت اب حالات بہت مختلف تھے۔ اس وقت مسلمان فاتح تھے اور اُنہیں سیاسی غلبہ حاصل تھا اور جن فلسفوں سے اُنہیں سابقہ پیش آیا تھا، وہ مفتوح ومغلوب قوموں کا فلسفہ تھا۔ اس وجہ سے ان فلسفوں کا حملہ بہت ہلکا ثابت ہوا۔ اس کے برعکس تیرہویں صدی ہجری میں یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا جب کہ مسلمان ہر میدان میں پٹ چکا تھا۔ اس کی سرزمین پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ معاشی حیثیت سے اُنہیں کچل ڈالا گیا تھا۔ ان کا نظامِ تعلیم درہم برہم ہو چکا تھا اور ان پر فاتح قوم نے اپنی تعلیم، اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے قوانین اور اپنے اجتماعی، سیاسی اور معاشی اداروں کو پوری طرح مسلط کر رکھا تھا۔ ایسے حالات میں فاتحوں کے فلسفے اور سائنس نے ان کو معتزلہ کی نسبت ہزار درجہ زیادہ مرعوب کر دیا۔ اُنہوں نے یہ سمجھ لیا کہ مغرب سے جو افکار ونظریات درآمد ہو رہے ہیں، وہ سراسر معقول ہیں۔ ان پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقید کر کے حق و باطل کا فیصلہ کرنا محض تاریک خیالی ہے اور زمانہ کے ساتھ چلنے کی صورت بس یہی ہے کہ اسلام کو کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق ڈھال لیا جائے۔[9]

برصغیر میں اس جدید فتنہ کے بانی اور سرخیل سرسید احمد خان تصور کئے جاتے ہیں جنہوں نے مغربی نظریات اور عقل وفلسفہ سے متاثر ہو کر نہ صرف جدید انکارِ حدیث کی داغ بیل ڈالی بلکہ اسلام کے بہت سے متفقہ مسائل کا بھی یا تو کلیۃً انکار کر دیا یا پھر ان میں من مانی تاویل کر دی جیسے معجزات کا انکار، فرشتوں کے وجود کا انکار، تجارتی سود کی حرمت کا انکار، پردہ کا انکار اور متعدد خرقِ عادت شرعی اُمور کا انکار وغیرہ۔[10] البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ سرسید احمد خان اَحادیث کی صحت کے منکر نہیں تھے بلکہ وہ احادیث سے استدلال بھی کرتے تھے، تاہم وہ صرف اُن احادیث کا انکار کرتے جو ان کے خود ساختہ معیار پر پوری نہ اُترتیں۔ جیسا کہ اُنہوں نے خود بھی یہ وضاحت فرمائی ہے۔[11] سرسید کے بعد مولوی عبداللہ چکڑالوی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں

---

⑨ آئینہ پرویزیت، از مولانا عبدالرحمٰن کیلانی: ص ۶۹

⑩ درسِ ترمذی، از مفتی تقی عثمانی: ص ۲۶ ⑪ مقالاتِ سرسید، از محمد اسماعیل پانی پتی: ۱۷/۱۳

نے حدیث کا کھلا انکار کیا۔[12] انہوں نے نعوذ باللہ حدیثِ نبوی کو لھو الحدیث قرار دیا۔[13] اور 'اہل قرآن' کے نام سے باقاعدہ ایک فرقے کی بنیاد رکھی۔[14]

عبداللہ چکڑالوی کے بعد مولوی احمد الدین امرتسری اور مولانا اسلم جیراجپوری اس فتنہ کے علم بردار بنے۔ بالآخر غلام احمد پرویز نے اس کی باگ دوڑ سنبھالی اور اسے ایک منظم مکتبِ فکر کی شکل دی اور اسے ضلالت کی انتہا تک پہنچا دیا۔[15]

ان حضرات کے علاوہ برصغیر میں تحریک انکارِ حدیث میں کسی نہ کسی طرح حصہ لینے والوں میں علامہ مشرقی، مستری محمد رمضان گوجرانوالہ، مجبوب شاہ، تمنا عمادی، قمر الدین قمر، سید عمر شاہ گجراتی، خدا بخش اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق (جنہوں نے بعد میں رجوع کرلیا تھا) وغیرہ بھی شامل ہیں۔[16]

حدیث چونکہ اسلام کے بنیادی ماخذ اور قرآن کی شارح کی حیثیت رکھتی ہے اور انکارِ حدیث کی صورت میں اسلام کا وہ حلیہ ہی مسخ ہوجاتا ہے جس کی عملی تصویر نبی کریم ﷺ نے پیش کی تھی۔ اس لئے اُمت نے کلیتہً انکارِ حدیث کو کبھی بھی قبول نہیں کیا۔ لہٰذا برصغیر میں جب بھی یہ فتنہ اُٹھا تو اہل علم نے اس کی پُرزور تردید کی۔ اس موضوع پر بیسیوں کتب تالیف کیں۔ مناظرے کئے، اجتماعات منعقد کئے اور رسائل و جرائد میں بحوث ومضامین قلم بند کیے وغیرہ وغیرہ۔ نتیجۃً فتنہ انکارِ حدیث کافی حد تک انحطاط کا شکار ہوگیا اور اسے عوام میں پذیرائی نہ مل سکی۔ اور اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ نہ تو آج سرسید کی تفسیر کو قبولِ عام حاصل ہے اور نہ ہی فرقہ اہل قرآن کا نام ونشان باقی ہے۔

بہرحال جب منکرین حدیث نے اس قدر شدید ردِّعمل دیکھا تو کلی طور پر انکارِ حدیث کی روش ترک کردی۔ بعدازاں مختلف حیلوں، بہانوں سے حدیث کو مشکوک بنانے کی کوشش شروع

---

⑫ حجیتِ حدیث، از محمد اسماعیل سلفی: ص ۱۷

⑬ حجیتِ حدیث اور اتباعِ رسولؐ، از ثناء اللہ امرتسری: ص ۱

⑭ درسِ ترمذی، از مفتی تقی عثمانی: ص ۲۶

⑮ سنت کی آئینی حیثیت، از مولانا مودودیؒ: ص ۱۶

⑯ آئینہ پرویزیت، از مولانا عبدالرحمٰن کیلانی: ص ۱۰۱

ہوئی اور ایسے نئے نئے طریقوں سے ردّ حدیث کا دروازہ کھولا گیا کہ احادیث کی تردید بھی ہوجائے اور اس کا احساس تک نہ ہو۔ چنانچہ ایک نعرہ یہ لگایا گیا کہ محدثین کا کام غیر جامع اور ناکافی ہے۔

محدثین کا کام غیر جامع اور ناکافی ہے!

اس ضمن میں قبول و ردّ حدیث کے نئے نئے اصول وضع کئے گئے جو متقدم محدثین میں سے کسی نے بھی بیان نہیں کئے تھے جیسے کہ

- جو روایت نص قرآنی کے خلاف ہو، وہ مردود ہوگی۔
- جو روایت سنتِ ثابتہ کے خلاف ہو، وہ مردود ہوگی۔
- جو روایت عقل عام کے تقاضوں پر پوری نہ اُترے وہ مردود ہوگی وغیرہ وغیرہ، خواہ اس کی سند کتنی ہی صحیح ہو۔

بالفاظِ دیگر ان حضرات کے نزدیک محدثین نے تحقیق سند کے سلسلے میں تو بہت کوشش کی ہے، مگر تحقیقِ متن کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے درج بالا تحقیق متن کے اُصول وضع کرکے گویا محدثانہ کاوش کے اس نقص کی تکمیل کی کوشش کی ہے۔

محدثین اور تحقیقِ متن: یہ بات کہ محدثین نے متن کی تحقیق کو ملحوظ نہیں رکھا، کوئی عالمانہ بات نہیں، کیونکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ جب وہ صحیح حدیث کی تعریف ذکر کرتے ہیں تو اس میں سند کے ساتھ ساتھ متن کی تحقیق کے اُصول بھی شامل کرتے ہیں۔ محدثین کی ذکر کردہ صحیح حدیث کی تعریف ملاحظہ فرمائیے:

أما الحديث الصحيح فهو الحديث المُسند الذي يتصل إسناده بنقل العدل الضابط إلى منتهاه ولا يكون شاذًا ولا معلّلا[14]

''صحیح حدیث وہ ہے جس کی سند متصل ہو، اسے نقل کرنے والے عادل وضابط ہوں اور وہ روایت شاذ ومعلول نہ ہو۔''

اس تعریف میں صحتِ حدیث کے لئے محدثین نے جن پانچ شرائط کا ذکر کیا ہے، ان

[14] مقدمة ابن الصلاح: ص۷

میں سے پہلی تینوں کا تعلق تو سند کے ساتھ ہے (لیکن یہ یاد رہے کہ چونکہ مقصود متن ہوتا ہے اور سند محض اس تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہی ہوتی ہے، لہٰذا یہ شرائط بھی نتیجۃً تحقیق متن پر ہی منتج ہوتی ہیں) تاہم آخری دونوں شرائط کا تعلق براہِ راست متن کے ساتھ ہے۔

چنانچہ امام سخاویؒ 'شاذ' حدیث کی تعریف میں رقم طراز ہیں کہ

ما يخالف الراوي الثقة فيه بالزيادة أو النقص في السند أو في المتن الملأ أي الجماعة الثقات من الناس بحيث لا يمكن الجمع بينهما[18]

''شاذ روایت وہ ہوتی ہے جس میں ایک ثقہ راوی الفاظِ حدیث کی کمی یا زیادتی میں ثقہ راویوں کی ایک جماعت کی مخالفت کرے جبکہ دونوں میں جمع وتوفیق بھی ممکن نہ ہو۔ یہ مخالفت بعض اوقات سند میں اور بعض اوقات متن میں ہوتی ہے۔''

'معلول' روایت کی تعریف میں امام حاکمؒ ذکر فرماتے ہیں کہ

فإن المعلول ما يوقف على علته أنه دخل حديثًا في حديث أو وهم فيه راو أو أرسله واحد فوصله واهم[19]

''معلول روایت وہ ہوتی ہے جس کی علت کے بارے میں یہ معلوم ہوجائے کہ اس میں راوی نے ایک حدیث کو دوسری حدیث میں داخل کردیا ہے یا اس میں راوی کو وہم ہوگیا ہے یا ایک راوی نے اسے مرسل بیان کیا ہے جبکہ وہم میں مبتلا ہونے والا اسے موصول بیان کررہا ہے۔''

ان تعریفات سے معلوم ہوا کہ صحیح حدیث کی تعریف میں محدثین نے جو آخری دو شرائط (عدمِ علت وعدمِ شذوذ) ذکر کی ہیں ان کا تعلق متن کے ساتھ ہے، اگرچہ بعض اوقات ان کا تعلق سند کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ تحقیق حدیث کے حوالے سے محدثین نے سند ومتن دونوں کو اہمیت دی ہے اور دونوں کے جامع اُصول مرتب فرمائے ہیں جو بعد کے تمام اَدوار کے لئے یقیناً کافی شافی ہیں۔ باوجود اس کے کہ محدثین کی ایک جماعت اِنہی اصولوں کو کافی خیال کرتے ہوئے ان پر کاربند رہی ہے اور کچھ تجدد پسند حضرات نے محدثانہ تحقیق متن کے اُصولوں پر مزید چند اصولوں کا اضافہ کرکے ائمہ سلف سے انحراف کی راہ اختیار کی ہے۔

---

[18] فتح المغیث: ص۱۹۶ [19] معرفۃ علوم الحدیث: ص۱۱۹

متجددین کے اُصولوں کی حقیقت

ہر چند کہ یہ لوگ اپنے اُصولوں کی تائید میں ائمہ محدثین کے ہی مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، لیکن دراصل یہ ائمہ محدثین کی عبارتوں اور موقف کا استحصال ہے۔ کیونکہ ان عبارتوں سے محدثین کی مراد اور ہے جبکہ متجددین کی مراد بالکل مختلف ہے۔ دونوں کے ہاں مختلف علامتوں اور امراض کی حیثیت اور مقام ومرتبہ مختلف ہے۔ چنانچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان اقوال کی حیثیت محدثانہ اُصولوں سے ٹکراؤ یا ان کے نقص کی تکمیل کی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے جو اَقوال وضع حدیث کی علامات کے بطور بیان کئے تھے، ان متجدد حضرات نے انہیں اُصولی حیثیت دے دی ہے اور انہی کو بنیاد بنا کر متفقہ طور پر صحیح سند احادیث کو بھی ردّ کرنا شروع کردیا ہے۔ اس نوعیت کے چند اقوالِ محدثین پیش خدمت ہیں:

① خطیب بغدادیؒ نے فرمایا ہے کہ

ولا يقبل خبر الواحد في منافاة حكم العقل وحكم القرآن الثابت المحكم والسنة المعلومة والفعل الجاري مجرٰى السنة وكل دليل مقطوع به [20]

''جب خبر واحد عقل کے فیصلے، قرآن کے ثابت اور محکم حکم، سنتِ معلومہ، سنت کی طرح جاری عمل یا دلیل قطعی کے خلاف آجائے تو وہ غیر مقبول ہوگی۔''

② امام ابن جوزیؒ نے فرمایا ہے کہ

كل حديث رأيته يخالف المعقول أو يناقض الأصول فاعلم أنه موضوع [21]

''ہر وہ حدیث جسے آپ عقل یا اُصول کے خلاف پائیں تو یہ جان لیں کہ وہ موضوع ہے''

③ امام ابن قیمؒ الجوزیہ نے نقل فرمایا ہے کہ

كل حديث يشتمل على فساد أو ظلم أو عبث أو مدح باطل أو ذم حق أو نحو ذلك فرسول الله ﷺ منه بريء. [22]

---

[20] الكفاية في علم الرواية از خطیب بغدادی: ص۴۳۲

[21] الموضوعات از ابن جوزی: ۱۰۶/۱ [22] المنار المنيف از ابن قیم: ص۶۵

''ہر وہ حدیث جو فساد، ظلم، بے مقصد اشیا، باطل کی مدح، حق کی خدمت یا اس جیسی کسی چیز پر مشتمل ہو تو رسول اللہ ﷺ اس سے بری ہیں۔''

یہ اور ان جیسے دیگر اقوالِ محدثین محض معرفت وضع الحدیث اور وضع حدیث کے قرائن وآثار کے قبیل سے بیان ہوئے ہیں۔ ان سے مقصود یہ ہرگز نہیں کہ کوئی روایت کب موضوع یا ضعیف ہوتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ محدثین جب بھی موضوع حدیث کی تعریف کرتے ہیں تو یہی بیان کرتے ہیں کہ ایسی احادیث جس میں کوئی واضع یا کاذب راوی پایا جائے، 'موضوع' کہلاتی ہے۔ (۴۳)

حقیقت یہ ہے کہ محدثین کرام نے حدیث میں صحت وضعف کی جانچ پرکھ کے لئے واضح اصولوں کے ساتھ بعض علامتیں اور امکانات کا تذکرہ بھی کیا ہے، جنہیں حدیث کا طالب علم ملحوظ رکھ کر ضعیف حدیث کی پہچان کرسکتا ہے۔ چنانچہ محدثین نے ایک عمومی جائزے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ضعیف اور موضوع روایات کے مردود ہونے کی بنیاد اگرچہ ضعیف اور کاذب راوی ہی ہوتا ہے مگر ایسی تمام روایات کے متون میں بھی کچھ علامات پائی جاتی ہیں جن سے وضع حدیث کا اشارہ مل جاتا ہے۔ لہٰذا اُنہوں نے ان علامات کو بھی ذکر کرنا شروع کردیا۔ یہی باعث ہے کہ اُنہوں نے یہ علامات قبول و رد حدیث کے قواعدِ کلیہ کے طور پر نہیں بلکہ وضع حدیث کی معرفت کے طور پر ذکر کی ہیں۔ جیسا کہ علامہ جمال الدین قاسمیؒ معرفة الوضع والحامل عليه کے عنوان کے تحت رقم طراز ہیں کہ

"ذكر المحدثون أمورًا كلية يعرف بها كون الحديث موضوعا...... " (۴۴)

امام سخاویؒ نے حافظ عراقی کی یہ عبارت نقل فرمائی ہے کہ

"يُعرف الوضع بالإقرار وما نزل منزلته وربما يعرف بالركة......" (۴۵)

اسی طرح حافظ ابن صلاحؒ نے فرمایا ہے کہ

"وقد يفهمون الوضع من قرينة حال الراوي أو المروي......" (۴۶)

درج بالا عبارتیں اس بات کی توضیح کے لئے یقیناً کافی ہیں کہ ائمہ محدثین کے جو اُقوال

(۴۳) تیسیر مصطلح الحدیث: ص ۶۲
(۴۴) قواعد التحدیث از جمال الدین قاسمی: ص ۱۱
(۴۵) فتح المغیث: ص ۲۶۹
(۴۶) مقدمة ابن الصلاح: ص ۸۹

عصر حاضر کے تجدد پسند حضرات قبول و ردّ حدیث کے نئے نئے اُصولوں کے طور پر پیش کررہے ہیں ان کی حیثیت محض علامات اور آثار وقرائن کی یہی ہے۔

جدید اُصولوں کی بنیاد 'ضعیف روایات'

ان متجددین نے سابقہ اَوراق میں ذکر کردہ چند اقوال محدثین کے علاوہ جن روایات پر اپنے افکار ونظریات کی بنیاد رکھی ہے، ان میں سے اکثر ضعیف اور من گھڑت ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیے۔ یہ فرمان نبوی عموماً بیان کیا جاتا ہے کہ

❶ «سيأتيكم عني أحاديث مختلفة فما جاء كم موافقًا لكتاب الله وسنتي فهو مني وما جاء كم مخالفًا لكتاب الله وسنتي فليس مني»[24]

''عنقریب تمہارے پاس میری طرف منسوب مختلف احادیث آئیں گی تو جو کتاب اللہ اور میری سنت کے موافق ہو، وہ تو میری طرف سے ہے اور جو کتاب اللہ اور میری سنت کے مخالف ہو وہ میری طرف سے نہیں۔''

اس روایت کو امام ابن عدیؒ، امام دارقطنیؒ، امام شافعیؒ، امام عجلونیؒ، امام خطابیؒ، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، امام شوکانیؒ اور شیخ البانیؒ نے سخت ضعیف اور من گھڑت قرار دیا ہے۔[25]

❷ «ما حدثتم عني مما تعرفونه فخذوه وما حدثتم عني مما تنكرونه فلا تأخذوا به»[26]

''اگر تمہیں میری طرف منسوب کرکے کوئی ایسی روایت بیان کی جائے جو اس معروف کے مطابق ہو جس سے تم آشنا ہو تو اسے قبول کرلو اور اگر کوئی ایسی روایت بیان کی جائے جسے تم منکر سمجھو، تو اسے قبول نہ کرو۔''

اس روایت کو امام ابن عدیؒ، امام ذہبیؒ، امام ابن رجبؒ، امام ابوحاتم رازیؒ اور شیخ البانیؒ

---

[24] الكفاية في علم الرواية: ص۴۳۰

[25] بالترتیب حوالہ جات: الكامل: ۱۰۶/۵، سنن الدارقطني: ۴۵۰/۳، الرسالة: ص۲۲۴، كشف الخفاء: ۸۶/۱، معالم السنن: ۹/۷، لسان الميزان: ۴۵۵/۱، الفوائد المجموعة: ص۲۱۱، السلسلة الضعيفة (۱۰۶۹)

[26] الكفاية في علم الرواية: ص۴۳۰

نے 'منکر' اور بہت زیادہ 'ضعیف' قرار دیا ہے۔[۳۰]

❸ «إنها تكون بعدي رواة يرون عني الحديث فأعرضوا حديثهم على القرآن»[۳۱]

''میرے بعد کچھ ایسے رواۃ ہوں گے جو میری طرف منسوب کر کے حدیث بیان کریں گے تو تم ان کی حدیث قرآن پر پیش کرنا۔''

امام دارقطنیؒ، امام ابن حزمؒ اور شیخ البانیؒ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔[۳۲]

سند سے قطع نظر متن کی تحقیق

تحقیق حدیث کے سلسلے میں محدثین کے ہاں اصل بنیاد سند ہی ہے۔ اس وجہ سے ان کے نزدیک سند کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ امام ابن مبارکؒ کا قول معروف ہے کہ

الإسناد من الدين ولولا الإسناد لقال من شاء ما شاء[۳۳]

''اسناد دین کا حصہ ہے۔ اگر اسناد نہ ہوتی تو کوئی جو چاہتا، کہتا پھرتا۔''

امام سفیان ثوریؒ نے فرمایا ہے کہ

الإسناد سلاح المومن فإذا لم يكن معه سلاح فبأي شيء يقاتل[۳۴]

''اسناد مومن کا ہتھیار ہے، اگر اس کے پاس ہتھیار ہی نہ ہو تو وہ کس چیز کے ساتھ جنگ کرے گا۔''

اسی طرح امام شافعیؒ کا قول بھی نہایت اہم ہے کہ

مثل الذين يطلب الحديث بلا إسناد كمثل حاطب ليل يعمل حزمة حطب وفيه أفعى وهو لا يدري[۳۵]

''بلا سند حدیث طلب کرنے والے کی مثال رات کو لکڑیاں چننے والے اس شخص کی طرح جو لکڑیوں کی گٹھڑی اُٹھاتا ہے، لیکن یہ نہیں جانتا کہ اس میں ایک سانپ بھی چھپا ہوا ہے۔''

---

[۳۰] بالترتیب حوالہ جات: الکامل: ۳۳۸/۴، سیر اعلام النبلاء: ۵۲۴/۹، جامع العلوم والحکم: ۱۰۵/۲، العلل: ۳۱۰/۲، الضعیفة (۱۰۹۰)

[۳۱] دارقطنی (۲۰۸/۴)

[۳۲] بالترتیب حوالہ جات: سنن دارقطنی: ۲۰۸/۴، ۲۰۹، الإحکام از ابن حزم: ۷۶/۲)، الضعیفہ (۱۰۸۷)

[۳۳] مقدمہ صحیح مسلم: ص ۸۷

[۳۴] فتح المغیث: ص ۳۳۵

[۳۵] المدخل از امام حاکم: ص ۲

سند کی اسی اہمیت کا نتیجہ ہے کہ محدثین کے نزدیک تحقیق حدیث کی اساسی شرائط تین ہی ہیں: ''عدل، ضبط اور اتصال پسند''[73]

اور اُنہوں نے جن دو شرائط (شذوذ وعلت) کا ذکر تحقیق متن کے حوالے سے کیا ہے، وہ بھی انتہائے تحقیق کے اعتبار سے درحقیقت سند اور رواۃ کی طرف ہی راجع ہوتی ہیں کیونکہ شذوذ مخالفتِ ثقات اور علتِ وہم الراوی کا نام ہے۔ لہٰذا شذوذ وعلت دونوں کا تعلق رواۃ کے ساتھ ہوا اور یہ معلوم ہے کہ رواۃ کا تعلق سند کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اس موقف کی مؤید یہ بات بھی ہے کہ یہ دونوں شرائط اُن تینوں شرائط میں ہی شامل ہیں جو محدثین نے تحقیق سند کے حوالے سے ذکر فرمائی ہیں (یعنی عدل، ضبط اور اتصالِ سند) یہی باعث ہے کہ محدثین ضبط وجرح کرنے والے اُمور میں کثرتِ اوہام اور شذوذ کا بھی ذکر فرماتے ہیں۔[74] البتہ محدثین نے علت وشذوذ کو جو الگ سے ذکر کیا ہے تو اس سے مقصود سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ تحقیق متن سے متعلقہ اُمور پر قدرے بہتر انداز میں توجہ دی جا سکے۔ معلوم ہوا کہ محدثین کے نزدیک تحقیق حدیث کی اصل بنیاد سند ہی ہے۔ لہٰذا اب اگر کوئی سند سے قطع نظر متن کی تحقیق کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہے تو یقیناً وہ اس محدثانہ طریق سے بدظنی کا مظاہرہ کر رہا ہے جس سے بدظنی کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے ذریعے ﴿وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ﴾[75] گمراہی کی بنیاد قرار دیا ہے۔

محدثین اور عقلی تقاضے

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ سند کو اہمیت دینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ محدثین نے تحقیق حدیث کے دوران عقل کو ملحوظ ہی نہیں رکھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے عقل کو بھی خصوصی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کتبِ اُصول میں صحتِ حدیث کی اوّلین شرط 'عدالت' مکتوب ہے اور عدالت کے متحقق ہونے کے لئے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، ان میں سے ایک عقل بھی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ صرف اس راوی کی روایت قبول کی جائے گی جو روایت لیتے وقت غفلت، سستی اور لاپرواہی جیسے رذائل سے کنارہ کش ہوتے ہوئے مکمل عقل وفکر سے کام لینے والا ہو اور ہر حدیث کو عقل سلیم کے سانچے میں پرکھنے کے بعد ہی قبول کرے۔ علاوہ ازیں ضبطِ راوی سے بھی یہی مراد ہے کہ راوی بیدار مغز

---

[73] النکت علی ابن الصلاح لابن حجر: ۲/۶۵۳

[74] تیسیر مصطلح الحدیث: ص ۱۰۹، ۱۰۲ [75] النساء: آیت نمبر ۱۱۵

ہو، سہو ونسیان اور تساہل کا شکار نہ ہو اور پورے غور وفکر اور توجہ کے ساتھ روایت سن کر اسے من وعن آگے بیان کردے۔ یہی وہ اساسی شرائط ہیں جن کی بنا پر کسی راوی کے مقبول یا غیر مقبول ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں احادیث پر صحت وسقم کا حکم لگاتے وقت بھی محدثین نے عقل کو ملحوظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے وضع حدیث کی علامات میں یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ روایت عقل عام کے خلاف نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ

بالفاظِ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ محدثین نے چار مقامات پر بطورِ خاص عقل کو ملحوظ رکھا ہے:

① تحمل حدیث کے وقت ② ادائے حدیث کے وقت

③ رواۃ پر حکم لگاتے وقت ④ اور احادیث پر حکم لگاتے وقت

یہی بات ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے ذکر فرمائی ہے۔[39]

یہاں یہ بات واضح رہے کہ عقل کو ملحوظ رکھنے کا مطلب محض یہی ہے کہ جو اوپر بیان کردیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ محدثین نے عقل کو ہی قرآن وسنت پر حاکم بنایا ہوا تھا۔ اور صرف وہی روایت قبول کرتے جو اپنی ذاتی عقل کے مطابق ہوتی (جیسا کہ آج کل کے متجددین کا نظریہ ہے) بلکہ فی الواقع ایسا ہے کہ محدثین عقل کو ملحوظ تو رکھتے تھے مگر اسے قرآن وسنت کے تابع رکھ کر استعمال کرتے تھے، ان کے ہاں عقل کو حاکمیت حاصل نہیں البتہ شریعت کے احکام کو سمجھنے میں وہ عقل کو بھرپور طریقے سے استعمال کرتے تھے۔

خلاصہ کلام: انکارِ حدیث کا آغاز اگرچہ دوسری صدی ہجری سے ہی ہوگیا تھا، لیکن اس فتنہ نے پوری آب وتاب اور سحر آفرینی کے ساتھ جس دور میں عوام الناس کو متاثر کیا، وہ تیرہویں صدی ہجری کا دور ہے کیونکہ اس میں برصغیر پر مغربی تسلط کے باعث یہاں اس فتنہ کے پنپنے کے محرکات دوسری صدی ہجری کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھے۔ بہرحال ہر دور کی طرح اس دور میں بھی اسے علماے حق کی طرف سے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں کلیۃً انکارِ حدیث کی روش ایک حد تک ختم ہوگئی، بعدازاں اس فتنہ نے ایک نئے روپ میں رونما ہوکر لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا۔ جس کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی کہ محدثین کا کام ناکافی ہے اور اُنہوں نے تحقیق سند کے حوالے سے تو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں مگر تحقیق متن پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس بنیاد پر تحقیق حدیث کے بہت سے ایسے جدید اُصول وضع کئے گئے جو متقدمین میں سے کسی نے بھی بیان نہیں کئے تھے۔ اور اگر اس ضمن میں کچھ بیان بھی کیا تھا کہ اس کا مقصد کچھ اور تھا جیسے خلافِ قرآن، خلافِ سنت یا عقلِ عام کے خلاف

[39] منهج النقد عند المحدثين: ص۸۳

تمام روایات ردّ کردی جائیں گی خواہ ان کی سند کتنی ہی صحیح ہو۔ ان اُصولوں کی ایجاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی متفقہ صحیح احادیث کو بھی ہدفِ تنقید بنالیا گیا جیسے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی بعض احادیث وغیرہ حالانکہ ان کی صحت پر جمہور ومحدثین کا اتفاق تھا۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ محدثین نے تحقیق سند کے ساتھ ساتھ تحقیق متن پر بھی پھر پور توجہ دی ہے جیسا کہ صحیح حدیث کی تعریف میں علت وشذوذ کا ذکر اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کیونکہ ان دونوں شرائط کا تعلق براہِ راست متن کے ساتھ ہے۔

علاوہ ازیں ان متجددین حضرات نے جن روایات کو تحقیق متن کے جدید اُصولوں کی بنیاد بنایا ہے، ان میں سے اکثر ضعیف اور من گھڑت ہیں اور جن اقوالِ محدثین کو تائید میں پیش کیا ہے، ان کی حیثیت قبول وردّ حدیث کے سلسلے میں قواعدِ کلیہ کی نہیں بلکہ محض علامات اور آثار و قرائن کی ہے۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ محدثین کبھی بھی موضوع روایت کی تعریف میں یہ بات ذکر نہیں فرماتے کہ جو روایت قرآن وسنت یا عقل کے خلاف ہوگی وہ موضوع ہے بلکہ وہ ہمیشہ یہی ذکر کرتے ہیں کہ ہمیں روایت کی سند میں کوئی کاذب یا واضع راوی پایا جائے، وہ موضوع ہے۔ بالفاظِ دیگر محدثین کے ہاں تحقیق حدیث کی اصل بنیاد سند ہی ہے اور تحقیق متن کے سلسلے میں جو اُنہوں نے علت وشذوذ کا ذکر کیا ہے، نتیجے کے اعتبار سے ان کا تعلق بھی سند کے ساتھ ہی ہے، کیونکہ علت وہم الراوی اور شذوذ مخالفتِ ثقات کا نام ہے اور یہ دونوں چیزیں رواۃِ سند سے ہی متعلقہ ہیں۔

یہاں اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ محدثین نے جو تحقیق حدیث کے سلسلے میں سند کو ہی بنیاد بنایا ہے تو اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ اُنہوں نے اس سلسلے میں عقلی تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض محض علم حدیث سے عدمِ واقفیت کا نتیجہ ہے ورنہ محدثین نے روایات کو پرکھنے کے لئے عقل کو بھی ملحوظ رکھا ہے جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ محدثین نے صحیح حدیث کی جو اوّلین شرط 'عدالت' بیان کی ہے، اس کے متحقق ہونے کی ایک شرط عقل بھی ہے۔ نیز دوسری شرط 'ضبط' کا تعلق بھی عقل وفہم اور غور وفکر کے ساتھ ہی ہے۔ لہٰذا فی الواقع ایسا ہے کہ محدثین کا کام جامع ہے اور کسی بھی حدیث کو پرکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے ہمیشہ اس کو پیش نظر رکھنا ہی راہِ صواب ہے اور ان ائمہ محدثین کے طریق سے انحراف قرآنی آیت ﴿غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ کے مصداق گمراہی میں مبتلا ہونے کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں راہِ ضلالت سے بچائے اور راہِ صواب پر چلائے۔ آمین!